استحصالی ٹیکس نظام کا خاتمہ، زکوٰۃ پر مبنی نظامِ عدل معاشی ترقی اور اجتماعی فلاح کا ضامن

حق نواز ولد اختر منیر
ایم ایس اسکالر، شعبہ قرآن وسنۃ
کراچی یونی ورسٹی
فون نمبر: 0312-3770021
ای میل: haqnawaz70021@gmail.com
پتا: مکان نمبر: B:296 محلہ خیبر کالونی پاپوش نگر، کراچی

فہرست

تعارف 1
استحصالی ٹیکس کی نوعیت اور اثرات 1
ٹیکس کی تعریف 2
اسلام میں ٹیکس کا تصوّر 2
عادلانہ ٹیکس لاگو کرنے کا حکم 3
ظالمانہ ٹیکس کا حکم 5
ظالمانہ ٹیکس کے نقصانات 6
ظالمانہ محصولات آزاد تجارتی کلچر کے لیے نہایت نقصان دہ ہوتے ہیں 9
پاکستان میں ظالمانہ ٹیکس 9
زکوۃ کی فرضیت واہمیت 10
زکوۃ کے مصارف 11
ٹیکس اور زکوۃ میں فرق 11
زکوۃ کی معاشی اور معاشرتی اہمیت 12
پاکستان میں نظامِ زکوۃ کا جائزہ 14
خلاصۃ البحث 16
سفارشات 16

تعارف

دنیا کا موجودہ معاشی نظام بالعموم سرمایہ دارانہ سوچ پر مبنی ہے، جس کی بنیاد استحصال، عدمِ مساوات، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور ارتکازِ دولت پر قائم ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور ٹیکس کے بڑھتے ہوئے بوجھ نے انسان کو معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ ایک طرف قلیل طبقہ ہے جو سرمایہ، وسائل اور تجارتی منڈیوں پر، بل کہ پورے نظامِ معیشت پر قابض ہے، جب کہ دوسری طرف اکثریت ان لوگوں کی ہے جو دن رات محنت کے باوجود بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہیں۔

اسی ظالمانہ نظام کا ایک اہم ستون "ٹیکس" ہے، جو بہ ظاہر ریاستی ضروریات کے نام پر عائد کیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں اس کا بیش تر حصہ غریب عوام سے بالواسطہ محصولات کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے، اور امیر طبقہ اکثر مختلف قانونی حیلے اختیار کر کے اس سے بچ نکلتا ہے۔ نتیجتاً ایک ایسا استحصالی نظام وجود میں آ جاتا ہے، جس میں غریب مزید غریب اور امیر مزید امیر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس تناظر میں اسلام ایک ایسا جامع اور فطری معاشی نظام پیش کرتا ہے، جو زکوٰۃ اور عشر جیسے اصولوں کی بنیاد پر عدل، توازن اور فلاحِ عامہ کو یقینی بناتا ہے اور دولت کی گردش کو اس طرح برقرار رکھتا ہے کہ پورا معاشرہ اس کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ میں اس امر کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا کہ کس طرح استحصالی ٹیکس کے مقابلے میں زکوٰۃ پر مبنی نظام عدلِ اجتماعی، معاشی ترقی اور اجتماعی فلاح کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

استحصالی ٹیکس کی نوعیت اور اثرات

ٹیکس بنیادی طور پر لاطینی زبان کا لفظ ہے جو *Taxo* سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ لازمی فنڈ یا محصول جو ریاست اپنے انتظامی امور کو چلانے اور رعایا کو مہیا کی جانے والی سہولیات پر اٹھنے والے اخراجات کی بابت وصول کرتی ہے۔ اس لفظ کا پہلی دفعہ استعمال چودھویں صدی عیسوی میں انگریزی زبان میں *Taxra* کے نام سے ہوا، جس کا مفہوم اندازہ یا تخمینہ لگانے کے ہیں۔[1]

ٹیکس کا تصوّر انسانی تاریخ جتنا قدیم ہے۔ معاشرتی نظم کے قیام، ریاستی امور کی تکمیل اور عوامی سہولیات کے فروغ کے لیے جب بھی کوئی منظم حکومت وجود میں آئی، وہاں کسی نہ کسی شکل میں محصول یا ٹیکس کا نظام قائم ہوا۔ مصر میں بادشاہی نظام کے تحت ایک باقاعدہ اور منظم ٹیکسیشن سسٹم موجود تھا، جو دو طریقوں پر مشتمل تھا: کووئی (*Corvée*) اور ٹتھی (*Tithe*):

کووئی (*Corvée*) ٹیکسیشن کا ایک ایسا طریقہ تھا، جس کے تحت غریب طبقے کو سرکاری منصوبوں (عمارتوں، نہروں، قبروں کی تعمیر) میں مفت مزدوری پر مجبور کیا جاتا تھا اور ٹتھی (*Tithe*) زراعتی ٹیکس تھا جس کے تحت کسانوں سے پیداوار کا پانچواں حصہ بہ طور محصول وصول کیا جاتا تھا۔[2]

فارس، یونان اور روم میں زمین، سر *(Head/Poll Tax)* اور درآمدی اشیاء پر ٹیکس عائد کیے جاتے تھے، کیوں کہ ان کی وصولی آسان تھی۔ رومی عہد میں سر شمار اور زمین پر ٹیکس عام تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں بہ راہِ راست ٹیکسوں کی جگہ لازمی خدمات اور تجارتی فیسوں نے لے لی، جب کہ شہری حکومتوں نے آمدنی اور جائیداد پر ٹیکس لگانا شروع کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ٹیکس عوامی اور سیاسی معاملات کا مرکزی موضوع بن گیا۔

امریکی انقلاب کا نعرہ *"No taxation without representation"* اور فرانسیسی انقلاب میں ٹیکسوں کی ناانصافی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ جنگوں نے ٹیکس نظام کو وسعت دی؛ آمدنی ٹیکس، خریداری ٹیکس اور تنخواہوں پر ٹیکس زیادہ تر جنگی ضرورتوں کے تحت شروع ہوئے، مگر بعد میں مستقل نظام بن گئے۔

جدید دور میں ٹیکس کا اختیار بادشاہوں سے پارلیمنٹوں کو منتقل ہوا۔ اجناس کے بہ جائے نقدی میں ٹیکس وصولی کا رواج ہوا اور ٹیکس فارمنگ ختم ہوگئی۔ بیش تر ممالک نے کسٹم اور ایکسائز ڈیوٹیوں کی بہ جائے سیلز ٹیکس اور ویلیو ایڈیڈ ٹیکس *(VAT)* کو اپنایا۔ ترقی یافتہ ممالک میں آمدنی، کارپوریٹ، اور تنخواہوں پر ٹیکس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ پسماندہ ممالک میں بالواسطہ ٹیکسوں پر انحصار زیادہ ہے۔[3]

ٹیکس کی تعریف

عربی میں ٹیکس کے لیے "ضریبۃ"، "مکس" اور "محصول" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں لفظِ محصول، جب کہ انگریزی میں *Duty, Customs, Tarif, Rates* اور *Charge* جیسے الفاظ ٹیکس وصولی کی مختلف اصطلاحات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن مقصود سب کا ٹیکس ہی ہوتا ہے۔

ٹیکس ایک ایسی لازمی ادائیگی ہے جو کسی ملک کے باشندوں پر حکومت کی طرف سے عائد کی جاتی ہے۔ یہ وہ قانونی حق ہے، جسے ہر شہری ادا کرنے کا پابند ہے اور حکومت اپنے شہریوں سے قانوناً اسے وصول کرنے کی مجاز ہے۔ ٹیکس کی ادائیگی کے عوض میں کوئی ٹیکس گزار حکومت سے کسی خاص خدمت کی صورت میں معاوضہ طلب نہیں کر سکتا۔[4]

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق "ٹیکس" کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''A compulsory contribution to the support of government, levied on persons, property, income, commodities, transactions, etc., Now at fixed rates, mostly proportional to the amount on which the contribution is levied .''[5]

"حکومت کی مدد و اعانت کے لیے لازمی طور پر وصول کی جانے والی ایک رقم، جو افراد، جائیداد، آمدنی، اشیائے صرف، تجارتی لین دین وغیرہ پر عائد کی جاتی ہے، اور عموماً مقررہ شرحوں پر وصول کی جاتی ہے جو اس مال یا قدر کے متناسب ہوتی ہیں جس پر یہ لاگو کی جائے۔"

اسلام میں ٹیکس کا تصوّر

اسلام نے ٹیکس کو دو قسموں (عادلانہ ٹیکس اور ظالمانہ ٹیکس) میں تقسیم کیا ہے۔

عادلانہ ٹیکس لاگو کرنے کا حکم

شریعتِ مطہرہ غیر مسلم رعایا پر چار قسم کے ٹیکس لگاتی ہے:(۱)خراج(۲)عشور(۳)ضریبۃ(۴)جزیہ، البتہ شریعتِ مطہرہ مسلم رعایا پر کسی قسم کا کوئی ٹیکس لاگو کرنے کے معاملے میں انتہائی حساس ہے۔ عام حالات میں بلاضرورت ٹیکس لگانے کو ظلم قرار دیا گیا ہے، جس پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں اور تاریخی حقائق سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ عہد نبوی۔ علی صاحبھا الف الف تحیۃ۔ میں قبل از فتوحاتِ خیبر ومکہ، حکومتی کاروبار چلانے، ریاستِ مدینہ کو طاقت ور دشمنوں کے خوف ناک حملوں سے بچانے اور رفاہی کاموں کی انجام دہی کے لیے زکوۃ، عشر وصدقاتِ نافلہ ہی واحد سبب اور ذریعہ تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد مالِ غنیمت، مالِ فیئ، مفتوحہ علاقوں کا خراج، اہلِ ذمہ کا جزیہ وغیرہ بیت المال کی آمدنی میں کثیر اضافے کا سبب بنے اور یہی وہ جائز ذرائع آمدن ہیں، جن سے حکومتی اخراجات پورے کیے جانے چاہییں، لیکن ظاہر ہے کہ اس دور میں جتنی بھی مخلص حکومت قائم ہو جائے تو بھی پہلے کے مقابلے میں اس کے اخراجات زیادہ ہیں اور حکومتی ذرائع آمدن کم ہیں، اور مالِ غنیمت، فیئ، جزیہ وغیرہ کا تو تصوّر ہی نہیں۔ اموالِ ظاہرہ کی زکوۃ بھی حکومت وصول نہیں کرتی، نہ ہی عشر کی وصولی کا کوئی انتظام ہے، اس لیے حکومت کو چلانے، ملک کے نادار طبقے کی ضروریات پورا کرنے کے لیے عادلانہ ٹیکس لاگو کرنے کے علاوہ کوئی صورت کارگر نظر نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ سابقہ ادوار میں بنابر ضرورت علمائے کرام نے عدل وانصاف پر مبنی قسم کے ٹیکس وصول کرنے کی اجازت دی ہے۔

❖ اندلس میں جب پانچویں صدی ہجری میں یوسف بن تاشفینؒ(م۵۰۰ھ) کے دور میں دفاعی اغراض کے تحت مزید ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت پڑی تو علمائے کرام سے اس بارے میں فتوی طلب کیا گیا، متعدد علمائے کرام (ان علمائے کرام میں فقہ مالکی کے مشہور عالم " ابو الولید الباجیؒ"(م۴۷۴ھ) بھی شامل تھے) نے یہ فتوی دیا کہ حسبِ ضرورت مزید ٹیکس عائد کیے جاسکتے ہیں۔[6]

❖ جب تاتاریوں نے شام پر حملہ کیا تو سلطان الظاہر بیبرسؒ(م۶۷۶ھ) نے ان کے مقابلے کے لیے جنگ کی تیاری کی، مگر بیت المال میں لشکر کی تیاری اور فوج پر خرچ کے لیے بہ قدرِ کفایت مال موجود نہ تھا، انہوں نے شام کے علمائے کرام سے استفسار کیا کہ کیا عوام کے مال سے کچھ رقم جنگی اخراجات کے لیے لی جاسکتی ہے؟ تو تمام علمائے کرام نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔[7]

❖ امام شاطبیؒ(م۷۹۰ھ) کے زمانے میں اندلس کے بعض علاقوں میں دفاعی مصالح کے تحت شہر پناہ تعمیر کرنے کے لیے ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔ اندلس کے مفتیان کرام نے اسے خلافِ شریعت قرار دیا، لیکن امام شاطبیؒ نے مصالحِ مرسلہ کے تحت اس کے جواز کا فتوی دیا اور اس کے حق میں دلائل پیش کیے۔[8]

❖ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب اس قسم کے ٹیکس کے لاگو کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:"آج کل حکومتوں کو بہت سے ایسی خدمات فراہم کرنا پڑتی ہیں جو پہلے حکومتوں کی ذمہ داری نہیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ملک میں بجلی اور گیس کی فراہمی، نیز بہت سے شعبے جو پہلے بھی ہوتے تھے، لیکن ان کے اخراجات اتنے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ آج ان کے اخراجات

دسیوں گناہ زیادہ ہو گئے ہیں، مثلاً دفاع کے لیے جدید ہتھیاروں کی فراہمی، پختہ سڑکوں کی تعمیر، مواصلات کے جدید ذرائع ابلاغ کے وسائل، تعلیم اور صحت، ان میں سے ہر چیز کے اخراجات یقیناً بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان میں سے بیش تر میں زکوۃ کی رقوم استعمال نہیں ہو سکتیں ،لہٰذا اگر مروّجہ فضول خرچیاں ختم بھی کر دی جائیں تب بھی مذکورہ بالا کاموں کے لیے صرف بیت المال کے محاصل کی معروف مدّات سے تمام اخراجات پورے ہونے بہ ظاہر مشکل ہیں۔۔۔لہٰذا اگر کوئی صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو کم از کم اپنے ابتدائی دور میں اسے "ضرائب النوائب" کی ضرورت پڑے گی۔" [9]

واضح رہے کہ علمائے کرام نے ٹیکس کے جواز کو چند شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے:

۱۔ حقیقی ضرورت اور قومی مفاد

جب ملک وملت کی سلامتی، بقااور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ٹیکس کی واقعی ضرورت ہو اور دستیاب وسائل سے وہ ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہوں، تو ایسی صورت میں ٹیکس لگانا جائز ہے۔اس کا مقصد صرف حکومتی آمدنی بڑھانا نہ ہو، بل کہ پیشِ نظر یہ ہو کہ قومی ضروریات پوری ہوں۔

مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی میں ہے "جب لوگوں کے ہاتھ (یعنی بیت المال) خالی ہو جائیں اور مصالحِ عامہ کے مال میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ فوج کی ضروریات پوری کی جا سکیں، تو ولیِ امر کے لیے جائز ہے کہ وہ مال داروں پر اتنا بوجھ (ٹیکس) عائد کرے جو لشکر کی کفایت کے لیے کافی ہو، کیوں کہ جب دو برائیاں یا دو نقصان آمنے سامنے ہوں، تو شریعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بڑے نقصان یا زیادہ برائی کو دور کیا جائے۔اس مسئلے میں بڑے علما مثلاً امام غزالی، عزّ بن عبد السلام، قرطبی، شاطبی، ابن عابدین رحمھم اللہ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔"[10]

۲۔ عوام کی استطاعت اور برداشت

ٹیکس کی مقدار ایسی مقرر کی جائے جو عوام کی مالی حالت اور استطاعت کے مطابق ہو، اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے کہ لوگ معاشی دباؤ یا تنگ دستی کا شکار ہو جائیں، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عثان بن حنیف اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما کو عراق کی زمین پر خراج مقرر کرنے کا حکم دیا تو فرمایا: "دھیان رہے، اہلِ زمین پر ان کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالنا۔" انہوں نے عرض کیا: "ہم نے ان کے لیے گنجائش اور زمین کی حالت کے مطابق رعایت رکھی ہے۔"[11]

۳۔ کفایت شعاری اور درست مصرف

ٹیکس سے حاصل شدہ رقم کو ملک و ملت کی حقیقی ضروریات پر خرچ کیا جائے۔ حکومت پر لازم ہے کہ کفایت شعاری اختیار کرے، فضول خرچی سے بچے، اور ٹیکس کے پیسے کو صرف عوامی مفاد پر صرف کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اے لوگو! کوئی صاحبِ حق اپنے حق کے مطالبے میں اس حد تک نہیں جا سکتا کہ اللہ کی نافرمانی تک پہنچ جائے۔ میں اس مال (بیت المال) کی درستی کے لیے صرف تین اصولوں کو کافی سمجھتا ہوں: اسے حق کے مطابق لیا جائے، حق کے مطابق دیا جائے، اور باطل سے روکا جائے۔ میں اور تمہارا مال یتیم کے ولی کی مانند ہیں، اگر میں بے نیاز ہوں تو دست کش رہوں گا، اور اگر محتاج ہوا تو معروف طریقے سے اس میں سے

لوں گا۔ اے لوگو! چند باتیں میں تم سے بیان کرتا ہوں، ان پر میری نگرانی کرنا، تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ تمہارے خراج یا اللہ کے عطا کردہ مال میں سے کچھ بھی ناجائز طور پر نہ لوں، اور جب میرے ہاتھ میں آئے تو وہ صرف حق کے مصرف میں خرچ ہو۔ تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ میں تمہارے عطیات اور وظیفے (تنخواہیں) بڑھاؤں، تمہارے سرحدی علاقوں کا تحفظ کروں، تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں، اور نہ ہی تمہیں جنگی مورچوں میں طویل عرصے تک روکے رکھوں۔"[12]

۴۔ وصولی کا نظام آسان، شفاف اور منصفانہ ہو

ٹیکس کی وصولی کا طریقہ کار آسان، شفاف اور منصفانہ ہو۔ ٹیکس وصولی کے دوران سختی اور ناروا سلوک سے گریز کیا جائے۔ امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) نے خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کو ٹیکس کی وصولی میں سختی سے منع کیا اور فرمایا: "کسی شخص کو خراج کے چند درہموں کے معاملے میں اذیت نہ دی جائے، نہ ہی اُسے کھڑا کر کے سزا دی جائے، کیوں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ اہلِ خراج کو دھوپ میں کھڑا کرتے ہیں، انہیں سخت مارتے پیٹتے ہیں، اُن پر گھڑے لٹکاتے ہیں اور اس طرح قید کرتے ہیں کہ وہ نماز بھی ادا نہیں کر پاتے۔ یہ طرزِ عمل اللہ کے نزدیک نہایت سنگین اور دینِ اسلام میں نہایت قبیح و مذموم ہے۔"[13]

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ ٹیکس (خراج) کی وصولی میں نرمی اور عدل و انصاف برکت اور خوش حالی کا سبب بنتے ہیں، جب کہ سختی اور ظلم و زیادتی شہروں کی بربادی اور ملک کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔[14]

امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) نے ٹیکس کے مسئلے پر بڑی مفصل اور عالمانہ بحث کی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ان حکم رانوں کی سخت مذمت کی ہے جو اپنی فوج کی عیش و عشرت، ذاتی آسائش یا غیر ضروری اخراجات کے لیے عوام پر ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا طرزِ عمل ظلم اور خیانت کے مترادف ہے۔

اس کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں: "اگر کوئی حاکم ایسا ہو جسے سلطنت کی سرحدوں کے تحفظ اور وسیع مملکت کے دفاع کے لیے زیادہ لشکروں کی ضرورت پیش آ جائے، جب کہ بیت المال خالی ہو اور فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وسائل نہ ہوں، تو ایسے وقت میں امام کو یہ اختیار ہے کہ وہ وقتی طور پر مال داروں پر اتنا بوجھ (محصول) عائد کرے جو ضرورت پوری کر دے، تاہم یہ بوجھ عارضی ہو اور بیت المال میں مال آنے پر ختم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی امام کو چاہیے کہ یہ بوجھ غلات اور پیداوار پر منصفانہ طریقے سے لگائے تا کہ کسی خاص طبقے پر زیادتی نہ ہو۔۔۔ اور بہ قدرِ ضرورت معمولی مقدار میں وصول کیا جائے تا کہ مقصد حاصل ہو جائے اور کسی پر ظلم نہ ہو۔"[15]

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اگر حکومتِ وقت شرعی اصولوں اور مذکورہ شرائط کی پابندی کرتے ہوئے ٹیکس عائد کرے تو عوام پر اس کی ادائیگی شرعاً واجب اور اخلاقاً ضروری ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم ظاہریؒ (م ۴۵۶ھ) نے بھی لکھا ہے۔[16]

ظالمانہ ٹیکس کا حکم

اسلام نے ظالمانہ ٹیکس کو بالکلیہ ختم کیا ہے، ایسا ٹیکس نہ کسی مسلمان پر لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی ذمی (کافر)

پر۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ظالمانہ ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔"[17] رسالتِ مآب ﷺ کا فرمان ہے: "ظالمانہ ٹیکس وصول کرنے والے کی مغفرت نہیں ہوگی۔"[18]

علامہ طیبیؒ (م ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں: "بے شک ناجائز ٹیکس لینا کبیرہ اور ہلاکت خیز گناہوں میں سے ہے، کیوں کہ لوگوں کے حقوق اس پر بہت زیادہ لازم آتے ہیں، ان کی شکایتیں اس کے خلاف کثرت سے ہوتی ہیں، کیوں کہ لینے والا بار بار لوگوں کا مال ناحق لیتا ہے اور اسے غلط مقامات پر خرچ کرتا ہے۔" [19]

شارح مسند احمد عبدالرحمن ساعاتی (م ۱۳۷۸ھ) فرماتے ہیں: "بے شک مکس (ناجائز ٹیکس لینا) گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ ہے، کیوں کہ لوگوں کے حقوق اور شکایتیں اس سے بہت زیادہ وابستہ ہوتی ہیں، اور وہ ان اموال کو ان کے جائز مصرف کے علاوہ جگہوں پر خرچ کرتا ہے۔"[20]

ظالمانہ ٹیکس کے نقصانات

علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) نے "مقدمۃ ابن خلدون" باب دوم، فصل ۳۸، ۳۹، اور ۴۰ میں ٹیکس اور محاصل پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں: "زیادہ ٹیکس کے نتیجے میں کام کرنے کی رغبت کم ہو جاتی ہے، جس سے پیداوار اور آبادی میں کمی واقع ہوتی ہے، لوگ ہجرت کرتے ہیں، اور ریاست کی آمدنی بھی گھٹ جاتی ہے۔"۔۔۔"قوم اور تمدن کے فروغ کا سب سے طاقتور ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں پر ٹیکس کم سے کم رکھا جائے۔ اس سے انہیں اعتماد اور معاشرتی خوش حالی کا احساس ہوتا ہے۔"[21]

علامہ ابن خلدون کی تفصیلی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکس اور شرحِ ٹیکس کی زیادتی، ملک وملت کی تباہی وبربادی، حکومت کے خاتمے، رعایا کے حوصلے پست کرنے اور ملکی معیشت پر منفی اثرات ڈالنے کا سبب ہے۔

مؤرخ مقریزی (م ۸۴۵ھ) نے مصروشام پر قائم مملوک سلطنت کے زوال کے تین بنیادی اسباب بیان کیے ہیں:

پہلا سبب: ریاستی اور مذہبی مناصب جیسے وزارت قضاوغیرہ پر فائز ہونے کا مدار رشوت پر تھا۔ خطیر رقم ادا کیے بغیر ان عہدوں تک پہنچانا ممکن نہ تھا، چناں چہ ہر جاہل مفسد، ظالم اور سرکش شخص سلطان کے کارپردازوں کے ذریعے ان عہدوں تک رسائی کی کوشش کرتا اور اس کے لیے بھاری رشوت ادا کرتا۔ منصب ملنے کے بعد یہی لوگ اپنی ادا کردہ رشوت واپس لینے کے لیے عوام پر ظالمانہ ٹیکس عائد کرتے۔ نتیجتاً دیہاتوں میں بسنے والے لوگ ظلم وستم سے تنگ آکر اپنی زمینیں چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوگئے، کھیت ویراں ہوگئے، زراعت تباہ ہوگئی اور اشیائے خورد ونوش کے نرخ بڑھ گئے۔

دوسرا سبب: حکومت اہلکاروں کے ذریعے زرعی اراضی پر ناجائز قبضوں کے باعث زمینوں کو کرایہ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا۔ بیج مہنگے ہوگئے، گندم سمیت بنیادی اجناس کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی۔ اس کے نتیجے میں زمین کی کاشت بیج، آب پاشی اور فصل کی کٹائی تک تمام مراحل کی لاگت بڑھتی چلی گئی، اگرچہ بیشتر زرعی زمینیں انہی طاقتور اہلکاروں کے ہاتھ میں تھی، جو اقتدار اور عسکری قوت رکھتے تھے مگر خواہشات کے حد سے بڑھ جانے اور مسلسل ظلم واستحصال کی باعث

زیادہ تر زمین زیرِ کاشت نہ رہ سکی۔ زرعی بحران بڑھا تو بہت سے کسان بھوک پیاس سے مر گئے، کہیں وطن چھوڑ گئے اور کاشتکاری کم ہونے سے مویشی تک ہلاک ہو گئے، یوں پورا ملک تباہی اور قحط خیزی کا شکار ہو گیا۔

تیسرا سبب: زمانۂ قدیم سے تمام اقوام (روم، فارس، بنی اسرائیل، یمن، یونان، عرب، حتیٰ کہ اسلامی خلافتیں) تک اصل کرنسی صرف سونا چاندی (دینار اور درہم) تھی۔ دنیا میں کبھی کوئی قوم (نہ قدیم نہ جدید) تانبے یا کسی غیر قیمتی دھات کو بہ طور اصل نقد (Currency) استعمال نہیں کرتی تھی۔ مصر میں پہلی بار فُلُوس (تانبے کے سکے) بڑے پیمانے پر رائج کیے گئے، جس سے مہنگائی بڑھی، مالی بد نظمی پیدا ہوئی، قیمتوں میں انتشار ہوا، اور لوگوں کا اعتماد مجروح ہوا، نتیجتاً بازار برباد، تجارت مفلوج اور عام زندگی تباہ ہو گئی۔ [22]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) نے سرکاری خزانے اور ٹیکسوں کے نظام پر بحث کرتے ہوئے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں تحریر فرمایا: "ہمارے زمانے میں ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کا بیت المال پر بوجھ بن جانا، اس طرح کہ بہت سے لوگ سرکاری خزانے سے وصولی کو ہی کمائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کبھی اس بنا پر کہ وہ مجاہدین میں سے ہیں، کبھی اس بہانے سے کہ وہ علما ہیں جن کا اس مال میں حق ہے، کبھی اس عادت کے مطابق جو بادشاہوں نے بنالی ہے کہ زاہدوں، شاعروں، اور دوسرے مخصوص طبقات کو عطیات دیتے ہیں، یا کسی نہ کسی شکل میں بھیک مانگنے کے ذریعے۔ ان کا مقصد ملک و ملت کی کوئی مصلحت نہیں ہوتا، بل کہ ان لوگوں کا مقصد محض اپنا پیٹ پالنا ہوتا ہے۔ اس طرح کے طبقات یکے بعد دیگرے بادشاہوں کے پاس آتے رہتے ہیں اور ان کے لیے زندگی مکدر کرنے کے ساتھ ساتھ اور آخر کار ریاست و معاشرہ پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ **دوسرا سبب کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا اور ان پر وصولی میں سختی کرنا**، یہاں تک کہ اس ظلم سے شریف اور اطاعت گزار لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں اور طاقتور لوگ بغاوت اور سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ اس لیے اہل زمانہ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہاں ٹیکسوں کا نفاذ کم سے کم ہو اور ان کی وصولی میں سہولت پیدا کی جائے۔ دوسرا یہ کہ ملکی نظم و نسق اور حفاظت کے لیے مقرر کردہ انتظامیہ صرف ضرورت کے مطابق ہونی چاہیے (تاکہ انتظامی اخراجات کا بوجھ کم سے کم ہو)۔" [23]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: "یہ ضروری ہے کہ عشر، خراج اور دیگر محصولات کی وصولی کے لیے ایک منصفانہ طریقہ اختیار کیا جائے جو رعایا کے لیے نقصان دہ نہ ہو اور ریاست کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ مناسب نہیں کہ ہر شخص پر یا ہر قسم کے مال پر ٹیکس لگا دیا جائے۔ مشرق و مغرب کے تمام حکم رانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محصول صرف مال داروں، دولت مندوں اور اُن کے بڑھتے ہوئے اموال سے لیا جانا چاہیے، جیسے پالنے والے مویشی، زراعت اور تجارت سے حاصل ہونے والا نفع۔ اور اگر اس کے باوجود مزید ضرورت پیش آئے، تو وہ بوجھ کمائی کرنے والے افراد کے سروں پر (یعنی اہلِ کسب و پیشہ) پر ہونا چاہیے۔" [24]

ماہر معاشیات ہینسن (Hanson) نے اپنی کتاب ''A Textbook of Economics'' میں ٹیکس کے درج ذیل منفی معاشی اثرات ذکر کیے ہیں:

ا۔ محنت کرنے کی حوصلہ شکنی

بہ راہِ راست ٹیکس (Direct Taxation) پیداوار پر منفی اثر ڈالتا ہے، کیوں کہ یہ لوگوں میں کام سے غیر حاضری (Absenteeism) کی رغبت پیدا کرتا ہے اور انہیں اضافی وقت (Overtime) میں کام کرنے سے روکتا ہے۔

۲۔ بچت اور سرمایہ کاری میں کمی

ٹیکس لوگوں کی بچت کی صلاحیت کو کم کر دیتا ہے، کیوں کہ ٹیکس دینے کے بعد ان کے پاس کم رقم بچتی ہے۔ یوں ٹیکس بچت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

۳۔ کاروباری سرگرمیوں میں رکاوٹ

جو لوگ منافع کو کاروباری جدوجہد کا صلہ سمجھتے ہیں، وہ منافع پر لگنے والے ٹیکس کی مخالفت کرتے ہیں، کیوں کہ اس سے کاروباری جذبہ کم ہوتا ہے۔ کاروباری حضرات صرف اسی وقت خطرناک منصوبوں میں سرمایہ کاری کرتے ہیں جب کامیابی کی صورت میں زیادہ منافع حاصل ہونے کا امکان ہو۔ بھاری ٹیکس ان سے یہ ممکنہ انعام چھین لیتا ہے اور ناکامی کی صورت میں کوئی تلافی نہیں دیتا۔

۴۔ ٹیکس مہنگائی میں اضافہ کا باعث

بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافہ مزدوروں کو زیادہ اجرت کے مطالبے پر مجبور کرتا ہے، جو بالآخر مہنگائی کو بڑھا دیتا ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں میں عام اضافہ اشیائے صرف کی قیمتوں کے اشاریے (Retail Price Index) کو بڑھاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اجرتوں میں اضافے کے مطالبات شروع ہو جاتے ہیں۔

۵۔ معاشی وسائل کی منتقلی

اجناس پر ٹیکس لگانا دراصل ان کی پیداواری لاگت بڑھانے کے مترادف ہوتا ہے، اس لیے رسد میں تبدیلی کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے، کیوں کہ قیمت اور پیداوار پر، اس کا اثر ہر شے کی طلب کی لچک کے مطابق ہوتا ہے۔ ٹیکسوں میں تفاوت کے نتیجے میں وسائل زیادہ ٹیکس والے شعبوں سے کم ٹیکس والے شعبوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔۔۔ جن علاقوں میں مقامی ٹیکس کی شرح زیادہ ہو، وہاں نئی صنعتوں کا قیام متاثر ہوتا ہے اور نئی کمپنیاں ایسے مقامات تلاش کرتی ہیں، جہاں ٹیکس نسبتاً کم ہو۔

بین الاقوامی سطح پر بھی یہی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ درآمدات پر ٹیکس لگانے سے پیداوار کم لاگت علاقوں سے زیادہ لاگت والے علاقوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کی مجموعی پیداوار اپنی ممکنہ حد سے کم رہ جاتی ہے۔[25]

ظالمانہ محصولات آزاد تجارتی کلچر کے لیے نہایت نقصان دہ ہوتے ہیں

ظالمانہ اور ناروا محصولات کی وجہ سے نہ صرف سرمایہ کار(*Investor*) اپنا سرمایہ چھپا لیتے ہیں، بل کہ دیگر ممالک کے تاجر آنا چھوڑ دیتے ہیں جس سے ملک کے اندر رسد کی کمی کی وجہ سے اشیائے ضرورت مہنگی اور پھر نایاب ہو جاتی ہیں، چناں چہ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ(م ۱۴۲۴ھ) بین الاقوامی تجارت میں عرب تاجروں کے ساتھ رومیوں کے ظالمانہ محصولات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی" میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔[26]

پاکستان میں ظالمانہ ٹیکس

معروف تجزیہ نگار ڈاکٹر فرح سلیم کے مطابق "پاکستان میں ٹیکس نظام کی ایک اور سب سے بڑی خامی بالواسطہ ٹیکسز ہیں۔ پاکستان میں جو ٹیکسوں کا نظام لاگو ہے، اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ 60 فیصد ٹیکسز بالواسطہ ٹیکس کی مد میں اکٹھے کیے جاتے ہیں اور 40 فیصد براہ راست ٹیکسز ہیں۔ بالواسطہ ٹیکس سے مراد یہ ہے کہ جیسے جیسے آپ کی آمدن کم ہوتی جاتی ہے، اس ٹیکس کا آپ پر بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ ٹیکس سسٹم یہ کر رہا ہے کہ پورے پاکستان کی حکومت چلانے کا خرچ پاکستان کے کم آمدن والے طبقے پر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔"[27]

ڈاکٹر اکرام الحق اور حذیمہ بخاری نے "پاکستان میں ٹیکس اصلاحات: تاریخی اور تنقیدی نظریہ" نامی کتاب میں پاکستان میں ٹیکس کے نظام پر تفصیلی گفتگو کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ

۱۔ پاکستان میں ٹیکس نظام ایک استحصالی (*Exploitative*) ڈھانچے میں بدل چکا ہے، جہاں دولت مند طبقے کو رعایتیں حاصل ہیں اور بوجھ غریب اور متوسط طبقے پر ڈالا جاتا ہے۔

۲۔ ٹیکس بیس (*Tax base*) کم ہونے کے دعوے اکثر غلط اور گمراہ کن ہیں، اصل مسئلہ نظام کی ناقص ساخت اور نااہل ٹیکس مشینری ہے۔

۳۔ بیرونی ڈونرز کے پیسوں سے بار بار "ٹیکس اصلاحات" کی ناکام کوششیں کی گئی ہیں، جو محض وقتی اور سطحی نوعیت کی رہیں۔

۴۔ پاکستان کا موجودہ ٹیکس ڈھانچہ فرسودہ، غیر پیداواری (*non-productive*) اور غیر شفاف ہے، جس میں کسی حقیقی ری انجینئرنگ یا از سرِ نو تشکیل کی کوشش نہیں ہوئی۔[28]

پاکستان میں ٹیکس کے نظام کی خرابی کے حوالے سے ڈاکٹر اکرام الحق لکھتے ہیں: "ترقی کی اس سطح کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک طرزِ حکمرانی (*governance*) کے تمام شعبوں اور ریاستی اداروں (*state institutions*) میں جامع ڈھانچہ جاتی اصلاحات نہ کی جائیں اور موجودہ فرسودہ اور جابرانہ ٹیکس ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔"[29]

حذیمہ بخاری لکھتی ہیں: "بدقسمتی سے پاکستان میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں (سویلین اور ملٹری) یکساں طور پر ٹیکس ریونیو کے اہداف کو رجعتی بالواسطہ ٹیکسوں کے نفاذ کے ذریعے حاصل کرتی رہی ہیں، یہاں تک کہ

انکم ٹیکس کی آڑ میں کئی *withholding* ٹیکسز نافذ کیے گئے ہیں جو اصل میں دوسروں پر منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارا ٹیکس کا نظام پیچیدہ اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کا مظہر ہے۔ نتیجتاً پاکستان میں کاروبار اور پیداوار کی لاگت اتنی زیادہ ہے کہ سرمایہ کاری کے لیے کوئی رجحان ممکن ہی نہیں۔ اس خراب ٹیکس پالیسی اور نظام کی بدولت ملک میں بلند افراطِ زر اور دولت، آمدنی کی عدمِ مساوات کی بڑھتی ہوئی لہر میں بے لگام اضافہ ہو رہا ہے۔"[30]

تمام تاریخی و معاصر مفکرین کی آراء سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ظالمانہ ٹیکس نظام ریاستوں کے زوال، معاشی انحطاط اور سماجی ناہمواری کا بنیادی سبب ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت واہمیت

زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی ستونوں میں سے ایک اہم اور عظیم ستون ہے، یہ وہ مالی حق ہے، جسے خالقِ کائنات نے اپنے نادار بندوں کے لیے امیروں کے مال میں مقرر فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں بیاسی مقامات پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم وارد ہوا ہے۔ ارشادِ باری ہے: "اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"۔[31]

قرآن کریم نے زکوٰۃ کو مال کی پاکی کا ذریعہ قرار دیا ہے[32] اور اس کی ادائیگی نہ کرنے پر سخت وعید فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں، اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ جس دن اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ، جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب چکھو! اس خزانے کا مزہ جو تم جوڑ جوڑ کر رکھا کرتے تھے۔"[33]

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس کے پاس مال ہو اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، تو قیامت کے دن اس کے لیے ایک گنجا زہریلا سانپ بنا دیا جائے گا، جس کی دو ابھری ہوئی زہریلی غدود ہوں گے۔ وہ اسے ڈھونڈتا پھرے گا، یہاں تک کہ اس کے گلے سے لپٹ جائے گا اور کہے گا: میں ہوں تیرا خزانہ!" [34]

زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد جب سرزمینِ عرب میں مختلف فتنے سر اٹھانے لگے، ان فتنوں میں اپنی سنگینی کے اعتبار سے بڑا فتنہ منکرینِ زکوٰۃ کا تھا۔ اسلامی ریاست مختلف بحرانوں کا شکار تھی۔ تاریخ کے اس نازک موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کمال جرأتِ ایمانی سے اکثریت کے مشوروں کے علی الرغم مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں اعلان کیا: "خدا کی قسم! میں ضرور اُن لوگوں سے قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرتے ہیں۔"[35]

نظامِ زکوٰۃ کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر یوسف قرضاویؒ (م ۱۴۴۴ھ) لکھتے ہیں: "اسلام کا نظام زکوٰۃ اجتماعی، سیاسی، اخلاقی اور دینی پہلوؤں کا حامل جامع، بے مثال مالی اور اقتصادی نظام ہے۔"[36]

مولانا ابوالحسن ندویؒ (م ۱۴۲۰ھ) لکھتے ہیں: "زکوٰۃ سے ہمدردی اور غم خواری کی روح عام ہو جاتی ہے۔ معاشرے

کے افراد میں خوش حالی نظر آنے لگتی ہے۔ مالوں میں برکت ہوتی ہے۔ دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسے کی فضا قائم ہوتی ہے۔"[37]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۳۹۹ھ) رقم طراز ہیں: "یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے، یہ ان کے بے کاروں کا سرمایہ اعانت ہے۔ یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعہ معاش ہے۔"[38]

خلاصہ یہ کہ زکوۃ صرف مالی عبادت نہیں، بل کہ ایک ایسا بے مثال معاشی نظام ہے جو فقیروں کی ترقی، مسکینوں کی خوش حالی، معاشی ترقی، سماج کی ہم آہنگی اور اجتماعی فلاح کا ضامن ہے۔

زکوۃ کے مصارف

اسلام نے زکوۃ دینے والے افراد، اس کی شرح، اور اس کی تقسیم کے اصولوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ کے فنڈ کو دوسرے مالی فنڈز کی طرح استعمال کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس کے مصارف سخت پابندی کے ساتھ متعین ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: "صدقات تو دراصل حق ہے فقیروں کا، مسکینوں کا اور ان اہل کاروں کا جو صدقات کی وصولی پر مقرر ہوتے ہیں۔ اور ان کا جن کی دل داری مقصود ہے۔ نیز انہیں غلاموں کو آزاد کرنے میں اور قرض داروں کے قرضے ادا کرنے میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں کی مدد میں خرچ کیا جائے۔ یہ اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔" [39]

ٹیکس اور زکوۃ میں فرق

زکوۃ اور ٹیکس میں فرق ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

۱۔ زکوۃ ایک مذہبی فریضہ ہے، جب کہ ٹیکس ایک قانونی ذمہ داری ہے۔

۲۔ زکوۃ کا نظام اسلامی شریعت کے اصولوں پر مبنی ہے اور یہ صرف صاحبِ نصاب مسلمانوں پر فرض ہے، جب کہ ٹیکس تمام شہریوں پر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

۳۔ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد مال کی پاکی اور تزکیہ نفس ہے، جب کہ ٹیکس کا مقصد عوام کی آمدن کا ایک حصہ لے کر اس سے نظام حکومت چلانا اور اس سے ملکی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ زکوٰۃ ادا کرنے والا آخرت میں اجر و ثواب کا امید وار ہوتا ہے، جب کہ ٹیکس ادا کرنے والے کو دنیا میں حکومت کی کچھ خدمات (*Services*) تو حاصل ہوتی ہیں، مگر ٹیکس دہندہ اسے حکومتی گرفت سے بچانے کے لیے ادا کرتا ہے نہ کہ آخرت میں ثواب کی امید سے۔

۵۔ زکوۃ مال دار اور اغنیا سے وصول کی جاتی ہے اور اور غریب، نادار، مساکین اور فقرا کو دی جاتی ہے، جب کہ ٹیکس (خواہ ظالمانہ ہوں یا عادلانہ، کم ہوں یا زیادہ) زیادہ تر متوسط طبقہ اور غربا سے وصول کیے جاتے ہیں اور اغنیا و امرا کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔[40]

۶۔ زکوٰۃ عموماً بچت پر لگتی ہے جس سے اندوختہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور سرمایہ گردش میں رہتا ہے، جس سے معیشت پر اچھا اثر پڑتا ہے، جب کہ ٹیکس عموماً آمدنی پر لگتے ہیں جس سے دولت جمع کرنے کی ہوس بڑھتی ہے اور سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے لگتا ہے۔

۷۔ زکوٰۃ ایک دینی فریضہ اور مالی عبادت ہے جسے بیش تر مسلمان بہ خوشی ادا کرنے میں ہی سعادت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اس میں رشوت کا بھی امکان بہت کم ہوتا ہے، جب کہ ٹیکس کو ایک بوجھ تصوّر کیا جاتا ہے۔ ٹیکس دہندہ کبھی پوری مالیت ظاہر نہیں ہونے دیتے اور ٹیکس وصول کرنے والے بھی رشوت لے کر خود ٹیکس چوری کی راہیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ملی بھگت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کو متوقع رقم کا نصف بھی حاصل نہیں ہوتا اور وہ ٹیکس بڑھانے اور مزید ٹیکس عائد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

۸۔ زکوۃ کی شرح کبھی گھٹتی بڑھتی نہیں یعنی ہر مسلمان صاحبِ نصاب خواہ اس کے پاس کتنا ہی مال و دولت کیوں نہ ہو، وہ صرف اس کا اڑھائی فیصد سالانہ کے حساب سے ادا کرنے کا پابند ہے، جب کہ کسی ٹیکس کی شرح حکومت جب چاہے گھٹا بڑھا سکتی ہے۔

۹۔ زکوۃ کی تقسیم جن لوگوں کے درمیان کی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید میں ان کی آٹھ مدیں مقرر کی گئی ہیں اور ان کی واضح نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اس تقسیم میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے، جب کہ ٹیکس کی رقم کو حکومت جس طرح چاہے خرچ کر سکتی ہے۔

۱۰۔ زکوۃ کی ادائیگی میں کسی قسم کی رعایت یا چھوٹ ممکن نہیں، جب کہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کوئی رعایت یا چھوٹ دے سکتی ہے۔[41]

زکوۃ کی معاشی اور معاشرتی اہمیت

زکوۃ کی ادائیگی سے معاشرے کو درج ذیل معاشی اور معاشرتی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں:

ا۔ فقر و فاقہ کے خاتمے میں زکوٰۃ کا کردار

سرمایہ دارانہ نظام میں عموماً دولت مند طبقہ معاشرے کے نادار، مسکین، بے روزگار، ضعیف، ناتواں یا بیوہ افراد کی کفالت کا ذمہ نہیں لیتا، اگرچہ بعض حکومتیں وقتی بندوبست کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن یہ اقدامات وقتی اور غیر مؤثر ثابت ہوتے ہیں، اس کے برعکس اسلام نے نظامِ زکوۃ کے ذریعے اس مسئلے کا مستقل حل فراہم کیا ہے۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے اور اس کے ذریعے فقیر، مسکین، یتیم، بیوہ، مقروض اور مسافر جیسے ضرورت مند طبقے کی مدد کی جاتی ہے۔ یہ عبادت کے طور پر ادا کی جاتی ہے، اس لیے مستحقین کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کا تسلسل سال بھر جاری رہتا ہے۔ یوں زکوۃ کا نظام غربت، فقر و فاقہ کے خاتمے کا مؤثر اور مستقل ذریعہ ہے۔

۲۔ دولت کی عادلانہ تقسیم

دنیا کے بیش تر ممالک، خصوصاً سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والے معاشرے، آج دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے

سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس نظام نے انسانیت کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے: ایک طبقہ انتہائی دولت مند اور دوسرا انتہائی غریب۔ امیر طبقہ عیش و عشرت میں مست، جب کہ غریب طبقہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے۔ اس عدمِ توازن سے معاشرے میں حسد، بغض، خود غرضی اور انتقام جیسے منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس خطرناک معاشی خلیج کو کم کرنے کے لیے زکوٰۃ کا جامع نظام پیش کیا، جس میں دولت امیروں کے ہاتھوں سے نکال کر مستحقین تک پہنچتی ہے۔ یوں دولت گردش میں رہتی ہے، طبقاتی خلیج کم ہوتی ہے، اور معاشرہ باہمی تعاون، ہمدردی اور عدلِ اجتماعی کی بنیاد پر مستحکم ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام دراصل اسلامی معیشت کی روح ہے، جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور انسانی برابری کو یقینی بناتا ہے۔

۳۔ ارتکازِ دولت کا حل

جب سرمایہ دار طبقہ دولت کو ذخیرہ کر کے معیشت کی گردش روک دیتا ہے تو پورا معاشرہ معاشی جمود، بے روزگاری اور عدمِ توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس خرابی کا علاج ان الفاظ میں بیان فرمایا: ”كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ“[42] ”تاکہ دولت تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے۔“

زکوٰۃ اسی قرآنی اصول کی عملی صورت ہے جو دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے نہیں دیتی، لہٰذا زکوٰۃ کے نظام کو مؤثر بنا کر ملکی دولت اور پیداواری وسائل کے چند ہاتھوں میں سمٹ جانے کی کیفیت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

۴۔ بے روزگاری کا تدارک

زکوٰۃ کا نظام معاشرے سے بے روزگاری کے خاتمے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ بہت سے ہنر مند، کاریگر اور باصلاحیت افراد صرف سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے فن اور تجربے سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ زکوٰۃ کی فراہمی سے انہیں کاروبار شروع کرنے یا اپنے ہنر کو وسعت دینے کا موقع ملتا ہے، جس سے وہ خود کفیل بن جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی روزگار کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح زکوٰۃ نہ صرف فرد کو محنت و عزت سے جینے کا حوصلہ دیتی ہے، بل کہ قومی سطح پر معاشی سرگرمیوں میں اضافہ اور بے روزگاری کے خاتمے کا ذریعہ بنتی ہے۔

۵۔ کساد بازی کے مسئلہ کا حل

زکوٰۃ کا ایک اہم معاشی پہلو یہ ہے کہ وہ دولت کو غیر پیداواری صورتوں میں مفلوج ہو جانے سے روکتی ہے۔ جب لوگ اپنی دولت کو سونا، چاندی یا زیورات کی شکل میں دفینوں کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں تو یہ سرمایہ معیشت کی گردش سے خارج ہو جاتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ کساد بازاری، سرمایہ کی قلت اور روزگار کے مواقع کی کمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی مال و دولت کو اس طرح رکھ چھوڑنے کی ترغیب نہیں دیتی کیوں کہ اس پر ہر سال زکوٰۃ کی ادائیگی سے مالیت کم ہوتی چلی جائے گی، چناں چہ اس وجہ سے لوگ اپنی دولت کو کسی نفع آور کاروبار میں لگائیں گے۔ شرکت و مضاربت کے اصول پر دوسرے لوگوں سے تجارت وغیرہ کرائیں گے، اس سے پبلک کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ روزگار کے مواقع زیادہ ہوں گے اور سرمایہ کاری بھی بڑھے گی۔

ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "آگاہ ہو جاؤ! جو کوئی کسی یتیم کا ولی ہو اور اس کے پاس مال و دولت ہو تو اس سے تجارت کرے اور اس کو یونہی نہ ڈال رکھے مبادا زکوٰۃ ہی اسے ختم کر ڈالے۔" [43]

٦۔ زکوٰۃ اسلام کے اجتماعی نظام کفالت کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلے میں سید قطبؒ (م ١٣٨٦ھ) لکھتے ہیں: "زکوٰۃ دراصل اسلام کے نظامِ تکافلِ اجتماعی کی ایک شاخ ہے، اور یہ نظام زکوٰۃ سے کہیں زیادہ جامع اور وسیع ہے، کیوں کہ یہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور باہمی تعلقات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جب کہ زکوٰۃ اس عظیم نظام کی ایک بنیادی کڑی ہے۔" [44]

ڈاکٹر یوسف قرضاویؒ (م ١٤٤٤ھ) نے اپنی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ کفالت مغرب کے اجتماعی نظامِ کفالت کے مقابلے میں زیادہ جامع، وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ نظامِ کفالت صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں، بل کہ زکوٰۃ اس نظامِ کفالت کا ایک اہم اور بڑا شعبہ ہے۔ نظامِ زکوٰۃ ایک طرح سے اجتماعی ضمانت ہے، کیوں کہ معاشرے کی اپنی ہی آمدن سے بغیر کوئی حصہ دیے ریاست عام بجٹ سے افراد کی کفالت کی ضمانت دیتی ہے، جس معاشرے کے ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ [45]

پاکستان میں نظامِ زکوٰۃ کا جائزہ

واضح رہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا اجتماعی نظام قائم کیا ہے اور اسلامی ریاست پر لازم قرار دیا کہ وہ مال داروں سے زکوۃ وصول کرے اور حقداروں میں تقسیم کرے۔ قرآن وسنت کے نصوص، پیغمبر علیہ السلام کا عمل، خلفائے راشدینؓ کا معمول اور فقہائے امتؒ کی تصریحات قدم قدم پر اس کی شہادت دیتی ہیں۔ دورِ نبوی ﷺ میں زکوۃ کی وصولی کے لیے باقاعدہ ایک منظم ڈھانچہ موجود تھا۔ عاملین صدقات، کاتبین صدقات، خارصین (پیداوار کا تخمینہ لگانے والے) جیسے عہدے متعین کیے گئے تھے تاکہ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم شفاف اور منظم انداز میں ہو۔ [46]

ابن سید الناس نے بیان کیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے سنہ ۹ ہجری میں مختلف قبائل پر الگ الگ مصدّقین (عاملینِ زکوٰۃ) مقرر فرمائے جو نہ صرف صدقات جمع کرتے تھے، بل کہ قبائل کے حالات سے بھی واقف رہتے اور مستحقین تک زکوٰۃ کی منظم تقسیم کا اہتمام کرتے تھے۔ اس منظم نظام کے نتیجے میں قبائل کے اندر خوش حالی اور معاشی استحکام پیدا ہوا، اور عہدِ نبوی ﷺ ہی میں غربت کم ہونے لگی۔ [47]

خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروقؓ نے زکوٰۃ کے اس نبوی نظام کو مزید مضبوط بنیادوں پر قائم رکھا، اور اسلام کے مالیاتی نظم میں سب سے پہلے اسی بات کو یقینی بنایا کہ کوئی بھی شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے غفلت نہ کرے۔ ان کے دور میں نظامِ زکوٰۃ محض ایک دینی فریضہ نہیں رہا، بل کہ ایک مؤثر سماجی فلاحی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ اس مضبوط اور منظم نظام کی عملی کیفیت کا اندازہ اس واقعے سے بہ خوبی ہوتا ہے کہ سن ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر اور عاملِ زکوٰۃ مقرر فرمایا۔ انہوں نے وہاں نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی

جامع ہدایات کے مطابق پورے نظمِ زکوٰۃ کو نافذ کیا۔ حضرت عمرؓ کے دور تک تقریباً سات سال کا عرصہ گزرا تھا، لیکن اس مختصر مدت میں اس نظام کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔

روایت کے مطابق: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لوگوں کی زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ بھیجا۔ حضرت عمر نے اسے ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے تمہیں خراج وصول کرنے والا یا جزیہ لینے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ میں نے تو تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم وہاں کے مال داروں سے زکوٰۃ لو اور وہیں کے غریبوں پر خرچ کر دو۔"۔۔ ۔پھر اگلے سال حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آدھی زکوٰۃ بھیجی اور تیسرے سال ساری کی ساری زکوٰۃ بھیج دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی سوال کیا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "مجھے وہاں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو۔"[48]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں زکوٰۃ کی رقم سے یتیم، محتاج، قرض دار اور دیگر مستحقین کی مالی امداد کی جاتی رہی، پھر ایک ایسا وقت آیا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی محتاج شخص تک میسر نہ آیا۔[49][50] اس طرح زکوٰۃ ایک باقاعدہ سماجی تحفظ کا نظام تھی۔

پاکستان میں زکوٰۃ اور عشر کا قانونی نظام جنرل ضیاالحق مرحوم(م۱۴۰۹ھ) کے دور میں ۱۹۸۰ء میں نافذ کیا گیا،اس کے تحت ہر سال یکم رمضان کو بینک اکاؤنٹس میں موجود نصاب کے مطابق رقم سے ۲.۵ فیصد زکوٰۃ خودکار طور پر کاٹی جاتی ہے۔اس نظام کے نفاذ کے لیے ملک بھر میں زکوٰۃ تقریباً ۳۲ہزار کمیٹیاں اور مرکزی کونسلیں قائم کی گئیں، جن کے اخراجات وفاق اور صوبائی حکومتیں برداشت کرتی تھیں۔ تاہم اس نظام میں بہت سے مسائل ہیں، جن میں بے ضابطگیاں، شفافیت کی کمی اور عوام کا اعتماد کم ہونا شامل ہے۔

۱۸ویں آئینی ترمیم (۲۰۱۰ء) کے بعد زکوٰۃ کا اختیار وفاق سے صوبوں کو منتقل کر دیا گیا، جس کے بعد پنجاب، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا نے اپنے قوانین بنا کر محکمے تشکیل دیے۔ تاہم صوبائی سطح پر بھی انتظامی کمزوریوں اور زکوٰۃ کے صحیح استعمال کے حوالے سے خدشات موجود ہیں۔

پاکستان میں موجودہ نظامِ زکوٰۃ میں چند بنیادی مسائل پائے جاتے ہیں:

۱۔ موجودہ نظام میں بینک اکاؤنٹس کو اموالِ ظاہرہ قرار دے کر حکومت کو جبری وصولی کا اختیار دیا گیا ہے، حال آں کہ یہ اموال دراصل اموالِ باطنہ ہیں۔

۲۔ اس نظام میں حولانِ حول کی شرط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، مقررہ تاریخ پر زکوٰۃ کاٹ لی جاتی ہے، چاہے اس مال پر ایک دن ہی کیوں نہ گزرا ہو۔

۳۔ قرآن مجید نے عاملینِ زکوٰۃ پر خرچ کرنے کی اجازت تو دی ہے، لیکن موجودہ نظام میں سیمینار، کانفرنسیں اور میلوں ٹھیلوں پر خرچ کیا جاتا ہے جو کہ غلط ہے۔

۴۔ مصارفِ زکوٰۃ میں سخت بے احتیاطی پائی جاتی ہے، کمیٹیوں میں بعض افراد کو بلا تحقیق ہزاروں روپے دے دیے جاتے ہیں۔

۵۔اس نظام کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ حکومت تو زکوٰۃ اکٹھی کرنے میں سرگرم رہتی ہے، لیکن اس کے خرچ کی تفصیلات سامنے نہیں لاتی، جس سے زکوٰۃ کے اصل اثرات ظاہر نہیں ہوتے اور لوگ خود زکوٰۃ دینے سے ہچکچانے لگتے ہیں۔

٦۔نظامِ زکوٰۃ کو قومی و علاقائی سیاست کے اثرات سے الگ نہیں رکھا گیا، جس کی وجہ سے اس کی افادیت کم ہوگئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ خامیاں نظامِ زکوٰۃ کے اثر کو محدود کر رہی ہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ نظام میں بنیادی اصلاحات کی جائیں۔[51]

خلاصۃ البحث

استحصالی ٹیکس کے مقابلے میں زکوٰۃ اسلامی معیشت میں ایک ایسا مستقل، عادلانہ اور جامع نظام ہے جو فقر کا خاتمہ، دولت کی منصفانہ تقسیم، وسائل کی مؤثر تخصیص، سرمایہ کاری کی ترغیب، اور اقتصادی استحکام کے قیام میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے زکوٰۃ کے نظام کو خلوصِ نیت سے نافذ کیا، تو اس کے عظیم مقاصد پورے ہوئے اور فرد و معاشرہ دونوں پر مثبت اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔ اس کی درخشاں مثال خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کا دور ہے، جب زکوٰۃ کا نظام اس قدر کامیاب ہوا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی محتاج شخص تک میسر نہ آیا۔[52] یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر زکوٰۃ کا نظام درست طور پر نافذ کیا جائے تو معاشرے میں حیرت انگیز تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ سید سابقؒ نے اس حقیقت کو خوب صورت انداز میں بیان کیا: ''زکوٰۃ وہ کارنامہ انجام دیتی ہے جو ٹیکس کبھی انجام نہیں دے سکتا۔''[53]

سفارشات

- اسلامی ممالک میں زکوٰۃ کے اداروں کو ریاستی سطح پر جدید مالیاتی نظم اور شفافیت کے ساتھ منظم کیا جائے۔
- زکوٰۃ کے مصارف کو قرآنِ کریم کے بیان کردہ آٹھ مصارف کے مطابق تقسیم کیا جائے تاکہ عدل و توازن برقرار رہے۔
- زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم میں ڈیجیٹل نظم، تحقیق و نگرانی کے جدید ذرائع اختیار کیے جائیں۔
- عوام میں زکوٰۃ کے فلاحی و معاشی پہلو سے آگاہی پیدا کی جائے تاکہ وہ اسے صرف عبادت نہیں، بل کہ اجتماعی ذمہ داری سمجھیں۔
- معیشت میں ٹیکس کے استحصالی نظام کی جگہ بتدریج زکوٰۃ پر مبنی مالیاتی ڈھانچہ قائم کیا جائے تاکہ اسلامی اصولوں کے مطابق معاشی عدل و استحکام پیدا ہو۔
- نظامِ زکوٰۃ شریعت بورڈ کی نگرانی میں چلایا جائے تاکہ اعتماد اور شفافیت برقرار رہے۔

حوالہ جات

[1] https://www.express.pk/story/1648753/tyks-nzam-ya-lgan-1648753?utm_source=chatgpt.com

[2] https://egypt-museum.com/tax-in-ancient-egypt/?utm_source=chatgpt.com

[3] https://www.britannica.com/money/taxation/History-of-taxation

[4] شیخ مبارک علی، ابتدائی معاشیات، کراچی اردو بازار، رہبر پبلیشرز، ص:۴۵۹۔

[5] *The Oxford English Dictionary ,LONDON،Oxford University Press، Walton Street, Vol. 11, p. 119.*

[6] ابن خلکان، ابو العباس، احمد بن محمد، وفیات الاعیان، بیروت، دار صادر ۱۹۹۴ء، ج:۷، ص:۱۱۹۔

[7] البیومی، محمد رجب: علماء في وجه الطغیان، الدار القومیة للطباعة والنشر، س ن، ص:۳۷۔

[8] التنبکتی، احمد بابا، نیل الابتهاج بتطریز الدیباج، طرابلس، دار الکاتب ۲۰۰۰ء، ص:۵۱۔ المشاط، حسن بن محمد، الجواهر الثمینة في بیان أدلة عالم المدینة، بیروت، دار الغرب الاسلامی، ۱۴۱۱ھ، ص:۲۵۳۔

[9] عثمانی، محمد تقی، مفتی، اسلام اور سیاسی نظریات، کراچی، ادارۂ معارف القرآن، س ن، ص ۳۰۳-۳۰۴۔

[10] مجموعة من المؤلفین، مجلة مجمع الفقه الاسلامی، جده، منظمة المؤتمر الاسلامی، س ن، ج:۱۱، ص:۵۰۰۔

[11] القاضی، ابو یوسف، محمد بن یعقوب، کتاب الخراج، القاهره، المکتبة الازهریة للتراث، ۱۴۲۰ھ، ص:۹۷۔

[12] ایضا: ص:۱۳۰-۱۳۱۔

[13] ایضاً، ص:۱۲۲

[14] ایضاً، ص:۱۲۵

[15] الغزالی، ابو حامد، محمد، شفاء الغلیل، بغداد، مکتبة الارشاد ۱۳۹۰ھ، ص:۲۳۶۔

[16] الظاهری، ابن حزم، علی بن احمد، المحلیٰ بالآثار، بیروت، دار الکتب العلمیة ۱۴۰۸ھ، ج:۴، ص:۲۸۱۔

[17] احمد بن حنبل، المسند، بیروت، مؤسسة الرسالة ۱۴۲۱ھ، ج:۲۸، ص:۵۲۶، الرقم:۱۷۲۹۴۔

[18] الطبرانی، سلیمان بن احمد، القاهره، مکتبة ابن تیمیة، س ن، ج:۹، ص:۵۴، الرقم:۸۳۷۱۔

[19] الطیبی، شرف الدین، الحسین بن عبد الله، شرح المشکاة، الریاض، مکتبة نزار مصطفى الباز ۱۴۱۷ھ، ج۸، ص ۲۵۱۹۔

[20] البنا الساعاتی، احمد بن عبد الرحمن، الفتح الربانی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن، ج ۱۵، ص:۱۸۔

[21] ابن خلدون، عبد الرحمن، مقدمة ابن خلدون، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۱ھ، ج:۱، ص:۳۴۴

[22] المقریزی، تقی الدین ابو العباس،، احمد بن علی، اغاثة الاة بکشف الغمة، مصر، عین الدراسات والبحوث الانسانیة، ۱۴۲۷ھ، ص:۱۱۷-۱۱۲۵۔

[23] الدهلوی، شاه ولی الله، حجة الله البالغة، بیروت، دار الجیل، ۱۴۲۶ھ، ج:۱، ص:۹۳۔

[24] آیضاً: ج:۱، ص:۹۶۔

[25]J. L. Hanson, *A Textbook of Economics*, 6th ed. (London: Pitman, Financial Times Prentice Hall, 1977), 577–579.

[26]حمید اللہ، ڈاکٹر، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، لاہور، نگارشات پبلشرز ۲۰۱۳ء، ص:۱۷۵۔

[27]شکور رحیم: حالات حاضرہ ادارت: افسر اعوان، پاکستان میں ٹیکسوں کے 600 ارب روپے کی پیش نظر۔
https://www.dw.com/ur/%D9%BE%D8%A7%DA%A9%D8%B3%D8%AA%D8%A7%D9%86-%D9%85%DB%8C%DA%BA-%D9%B9%DB%8C%DA%A9%D8%B3%D9%88%DA%BA-%DA%A9%DB%92-600-%D8%A7%D8%B1%D8%A8-%D8%B1%D9%88%D9%BE%DB%92-%DA%A9%D8%B1%D9%BE%D8%B4%D9%86-%DA%A9%DB%8C-%D9%86%D8%B8%D8%B1/a-6292773

[28] تفصیل کے لیے دیکھیے: *Bukhari, Huzaima, and Ikramul Haq. Tax Reforms in Pakistan: Historic & Critical View. Islamabad: Pakistan Institute of Development Economics, 2020.*

[29]اکرام الحق، ڈاکٹر، اٹھارویں دستوری ترمیم اور نظام محصولات میں اصلاحات، https://urdu.nayadaur.tv/25-Oct-2025/28239#google_vignette

[30]حذیمہ بخاری، 2025: ترقی اور خوش حالی کے لیے ٹیکس پالیسی کیسی ہو؟ https://urdu.nayadaur.tv/02-Jan-2025/27331

[31]البقرۃ۲: ۴۳۔

[32]التوبۃ۹: ۱۰۳۔

[33]ایضاً: ۳۴-۳۵۔

[34]مالک بن انس، الامام، مؤطا، ابو ظبی، مؤسسۃ زاہد بن سلطان ۱۴۲۵ھ، ج:۲، ص:۳۶۱، الرقم:۸۸۷۔

[35]عبد الرزاق بن ہمام، المصنف، الہند، المجلس العلمی ۱۴۰۳ھ، ج:۴، ص:۴۳، الرقم ۶۹۱۶۔

[36]القرضاوی، یوسف، الڈاکٹر، فقہ الزکاۃ، بیروت، دارالرسالۃ العالمیۃ، ۱۴۳۰ھ، ج:۲، ص:۶۳۲۔

[37]الندوی، ابوالحسن، علی، ارکان اربعہ،، انڈیا، لکھنو، مجلس تحقیقات ونشریات، اسلام ۱۳۹۹ھ، ص:۱۵۳۔

[38]سید ابوالاعلی مودودی، مولانا، معاشیاتِ اسلام، لاہور، ارقم آفاق پریس ۲۰۱۳ء، ص:۱۰۹۔

[39]التوبۃ۹: ۶۰۔

[40]الندوی، ابوالحسن، علی، ارکان اربعہ، ص:۱۵۳۔

[41] زکوۃ اور ٹیکس میں فرق کے لیے دیکھیے: ابتدائی معاشیات از شیخ مبارک علی، کراچی اردو بازار، رہبر پبلیشرز۔ اسلام اور جدید معاشی تصوّرات، از پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، لاہور، مکتبہ دانیال۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ از وہبۃ الزحیلی، دمشق، دارالفکر۔ نوازل الزکاۃ از عبد اللہ بن منصور الغفیلی، الریاض، دارالمیمان۔

[42]الحشر۵۹:۷۔

[43]الترمذی، محمد بن عیسی، السنن، بیروت، دارالغرب الاسلامی، ۱۹۹۶ء، ج:۲، ص:۲۵، الرقم:۶۴۱۔

[44]سید قطب، ظلال القرآن، بیروت، دارالشروق، ۱۴۲۳ھ، ج:۳، ص:۱۶۶۹۔

[45]القرضاوی، یوسف،، فقہ الزکاۃ، بیروت، ج:۲، ص:۲۷۵-۳۷۷۔

[46]المرداوی، علاءالدین علی بن سلیمان، الانصاف، ھجر للطباعۃ ۱۴۱۵ھ، ج:۷ ص:۲۲۲، مجموعۃ من المؤلفین، الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ، الکویت، دارالسلاسل ۱۴۲۷ھ، ج:۲۹، ص:۲۲۸۔

[47]ابن سید الناس، محمد بن محمد، عیون الاثر، بیروت، دارالقلم ۱۴۱۴ھ، ج:۲، ص:۲۵۲۔

[48]ابو عبید، کتاب الاموال، ص:۷۱۰، الرقم:۱۹۱۲۔

[49]ایضا، ص:۳۱۹، الرقم:۶۲۵۔

[50]الواسطی، اسلم بن سہل، تاریخ واسط، بیروت، عالم الکتب ۱۴۰۶ھ، ص:۱۸۴۔

[51]مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: جالندہری، خیر محمد، خیر الفتاوی، ملتان، مکتبۂ امدادیہ، س ن، ج:۳، ص:۶۰۸۔

[52]الواسطی، اسلم بن سہل، تاریخ واسط، ص:۱۸۴۔

[53]Sayyid Sabiq, Fiqh al-Sunnah: Az-Zakah and As-Siyam (Washington, DC: American Trust Publications, Vol. 3, p. xvi.